بیداریِ ملت کا معمار
اور
فکرِ نو کا پیامبر

ڈاکٹر علی شریعتی



قرآن توحید اور رسالت
کا شاہکار ہے

ابو حیان سعید

ڈاکٹر علی شریعتی: بیداریِ ملت کا معمار اور فکرِ نو کا پیامبر

ابو حیان سعید
13 مارچ 2026.

اس مضمون کا مطالعہ کرنے سے پہلے 1970 تا 1977 کے ایران کو سمجھنا ضروری ھے کہ جہاں ایرانی شہنشاہیت کا سورج آب و تاب سے چمک رہا ھے دوسری طرف جامد ایرانی ملائیت کی افیون ایرانیوں کو عشروں سے سلائے رکھے ہوئ ھے . آمریت چاھے شہنشاہیت کی شکل میں ھو یا ملائیت کے روپ میں ھو ، سماج و معاشرہ کی اصلاح کو برداشت نہی کرتی . ایسے میں ڈاکٹر علی شریعتی ایرانیوں کے لیئے امید کی کرن بن کر سامنے آئے اور اپنی تحریر و تقریر سے انقلاب کی راہ ھموار کی .

ڈاکٹر علی شریعتی (1933/ 1977) بیسویں صدی کے وہ نابغہ روزگار مفکر تھے جنہیں "معلمِ انقلاب" کا خطاب دیا گیا۔ انہوں نے ایک ایسے وقت میں علمِ حق بلند کیا جب ایرانی معاشَرہ ایک طرف شاہ کی آمریت اور مغربی استعمار کے زیرِ اثر تھا ، اور دوسری طرف ایرانی ملائیت نے اسلام کی اصل روح کو مسخ کر دیا تھا۔

اگرچہ ان پر ملائیت زدہ حلقوں کی طرف سے بہت زیادہ روشن فکر ہونے کا بھی الزام ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ باقاعدہ کسی دینی مدرسے یا حوضہ کے طالب علم نہیں رہے بلکہ وہ روایتی مدرسوں اور حوضہ کو اسلام کے خلاف صفویت کا آلہ کار گردانتے تھے . انھوں نے حسینیہ ارشاد میں لیکچر دیتے ہوئے کہا " قرآن توحید اور رسالت کا شاھکار ھے " .

آپ تصور کریں ھزاروں افراد جن میں طالب علم ، دانشوران ، شاہ ایران کی حکومت کے سر کردہ اراکین اور ایرانی ملائیت کے نمائندے حسینیہ ارشاد میں جمع ھیں تمام کے تمام افراد ھمہ تن گوش ھیں اور صرف علی شریعتی کی گونج دار آواز چھائ ہوئ ھے ، حسینیہ ارشاد میں اپنے لیکچر میں ڈاکٹر علی شریعتی فرما رہے تھے " ابو بکر صدیق عَلَیہِ السَّلام عزم اور استقامت ، عمر بن الخطاب عَلَیہِ السَّلام ہمت و جرات اور شجاعت، عثمان بن عفان عَلَیہِ السَّلام سخاوت و قربانی اور علی بن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام اپنے پیش رو حضرات کی ان تمام اعلی خصوصیات کا مجموعہ ھیں ."

حسینہ ارشاد میں ایک لیکچر کے دوران جب کسی نے نعرہ حیدری بلند کیا تو ڈاکٹر علی شریعتی نے فرمایا "

تم نے امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کو ایک بُت کی حیثیت دے دی ہے ۔ جسے صرف پوجا جا سکتا ہے ۔ان کی تعلیمات سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا ۔اب تم خواہ گریہ کرو ، سر پٹخو ، چیخو ، فریاد کرو ، عشق سے دیوانے ہو جاؤ ، کچھ بھی کر لو ۔ تم علی کو فرشتہ بنا دو یا جو چاھے مان لو ۔ اس سے تمہارے ایمان پر کوئی مثبت اثر نہیں پڑے گا ۔ کیونکہ تم امیر المومنین علی بن ابی طالب کی معرفت سے گھبراتے ہو تاکہ تم... علی کے کردار کو اپنی زندگیوں پر لازم کرنے کی ذمہ داری سے بچ جاؤ ۔“

ان کے مشہور جملوں میں سے ہے: " اب میں سمجھ چکا ہوں کہ خدا کے لیے جینا خدا کے لیے مرنے سے مشکل کام ہے"

"قرآن جو قوموں کو زندہ کرنے کے لیے آیا تھا اس کو ہم نے مردوں کو اور قبرستانوں کو سنانے تک محدود کر دیا ہے" .

ایک لیکچر میں فرماتے هیں ” میں نے دنیا میں رائج کئ معاشی نظاموں کو قریب سے دیکھا هے لیکن قرآن کا معاشی نظام ایک کامل معاشی نظام هے “

جیسے فرانس کے انقلاب کو والٹیر اور روسو جیسے دانشوروں نے انقلابی فکر بخشی ویسے ہی ایرانی انقلاب کیلئے ذہن سازی کا زیادہ تر کام ڈاکٹر علی شریعتی نے کیا، صرف 43 سال کی عمر میں جلاوطنی کے دوران پراسرار طورپر قتل ہوجانیوالے ڈاکٹر علی شریعتی نے 22سال تعلیم میں لگائے، 9سال مختلف اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھاتے رہے، 5سال جلاوطن اور سوا 2 سال شاہ ِایران کے قیدی رہے، لہٰذا اگر جمع وتفریق کی جائے تو اس فلسفی، مفکر اور دانشور کے پاس سکون اور اطمینان کے صرف 5 سال ہی بچتے ہیں لیکن کام دیکھا تو معلوم ہو کہ مختصر سی مدت میں اُنہوں نے ایران اور ایرانی قوم کیلئے جو کچھ کیا، کوئی دوسرا شاید100 سال میں بھی نہ کر پاتا۔ 25کتابوں کے مصنف ڈاکٹر علی شریعتی نے تب کلمہ حق بلند کیا جب محمد رضا شاہ پہلوی آریا مہر کے دور شہنشاہی میں علم شناسی اور مردم شناسی یہ تھی کہ یونیورسٹی آف پیرس فرانس سے سوشیا لوجی میں پی ایچ ڈی کر کے ایران پہنچے ڈاکٹر شریعتی کو فردوس نامی قصبے میں اسکول ماسٹر لگا دیا گیا وہ تو اس ’’تاریخی تقرری‘‘ پر جب ہر طرف شور مچا تو مجبوراً محکمہ تعلیم کو انہیں مشہد یونیورسٹی میں پروفیسر لگانا پڑا۔

70ء کی دہائی میں تہران کے ایک غیر سرکاری مذہبی ادارے ’’حسینیہ ارشاد‘‘میں تاریخ

شناسی اورانسان شناسی کی نظریاتی وتصوراتی تعلیم دینے والے علی شریعتی بلاشبہ اپنے دور کے ایک بڑے مقرر تھے، جب وہ بولتے تو مخالفین بھی سننے، سر دھننے پر مجبور ہوجاتے اور ہر مکتبہ فکر کے لوگ ٹوٹ ٹوٹ پڑتے، ذرا دیکھئے اپنی ایک تقریر میں وہ عام لوگوں کو کیسے مذہب سمجھا رہے ''دوستو میں علی شریعتی بن محمد تقی شریعتی حیران ہوں کہ مذہب کے نام پر تم کن بھول بھلیوں میں گم ہوچکے، کیا تم نے اپنا دین بھلا دیا، اگرایسا ہے تو آؤ اسلام سے میں تمہارا تعارف کراؤں''، سنو ''قران کا آغاز (بسم اللہ) سے اور اختتام (الناس) پر، قرآن میں جہا ں کہیں بھی اجتماعی زندگی کا ذکر آیا وہاں اللہ کے ساتھ الناس آیا، یاد رکھو اللہ قرآن کی روسے رب الناس (لوگوں کے پروردگار) ملک الناس (لوگوں کے بادشاہ) اور الٰہ الناس (لوگوں کے حقیقی معبود) گویا ہر اعتبار سے اللہ تمام انسانوں کے رب، کسی خاص مکتبِ فکریا گروہ کی اللہ پر کوئی اجارہ داری نہیں، غور سے سنو، ہر معاشرے میں دو طبقے، ایک ہابیل کی طرح صاحبِ ایمان، فداکار اور صلح پرست اوردوسرا قابیل کی طرح برادر کش، بے ایمان اور مادہ پرست، میں تمہیں ایک اور بات بتانا چاہتا ہوں کہ ذہن نشین کر لو کہ توحید و رسالت کے بعد قرآن میں موضوعات کے اعتبار سے پہلا درجہ عبادات کا، دوسرا اخلاقیات کا اور تیسرا معاشرے کا، حالانکہ اگر قرآن پاک کی سورتوں کے عنوانات کی درجہ بندی موضوعات کے اعتبار سے کی جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ 60فیصد سے زیادہ سورتوں کے موضوعات کا تعلق اُس دنیا سے جو انسان نے ابھی مسخر کرنی ھے، اس معاشرے سے جو انسان نے ابھی تعمیر کرنا اوراس فلسفے سے جو اس کام میں انسان کی رہنمائی کرے۔

یہ ڈا کٹر شریعتی ہی ہیں کہ جنہوں نے یہ کہا ''انسان اور اس کی روح چار قسم کے قید خانوں میں بند، اول زندانِ طبیعت یعنی نیچر، دوئم زندانِ تاریخ، سوم زندانِ معاشرہ اور چہارم زندانِ ذات، انسان پہلے تین قید خانوں سے تو علم و عقل کے سہارے نکل سکتا ہے مگر چوتھے قید خانے سے دین کے علاوہ اسے کوئی رہائی نہیں دلا سکتا''، یہ ڈاکٹرعلی شریعتی ہیں کہ جنہوں نے یہ بتایا ''جو مذہب انسان کو مرنے سے پہلے فائدہ نہیں پہنچا سکتا، وہ مرنے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا''، یہ ڈاکٹرعلی شریعتی ہیں کہ جنہوں نے یہ سمجھایا ''خدا کیلئے جینا، خدا کیلئے مرنے سے کہیں زیادہ مشکل'' اور ''موجودہ معاشرے میں شعور رکھناایک ناقابل معافی جرم''، یہ ڈاکٹر شریعتی ہیں کہ جن کی یہ سوچ ''اسلامی تمدن کی روح کے 2 بنیادی اصول توحید اور رسالت اور انہی دو اصولوں پر ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کی عمارت کھڑی '' اور'' مستقبل کے تعلیم یافتہ انسان کا مکتب ِفکر آج کے تعلیم یافتگان کے بر عکس ایک مذہبی مکتب ِ فکر ہوگا اور تب اس مذہب کی حکمرانی ہوگی جو سائنس سے بہتر جانا جائے گا ''، یہ ڈاکٹر شریعتی ہی کہ جن کا یہ وجدان '' سب سرمایہ، مال ودولت اور سونا چاندی جو کچھ لوگوں نے جمع کر رکھا اسے تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم کیا جانا چاہئے ''

اوریہ ڈاکٹر شریعتی ہی کہ جن کی یہ منطق ” اسلام وہ چراغ ہدایت کہ جو نہ شرقی اور نہ غربی، یہ تو وہ پاکیزہ شجر کہ جس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئیں لیکن میں حیران ہوں کہ یہ کونسا اسلام کہ جس میں انسان اپنے اِردگرد بھوک، غربت، اسیروں کی سسکیاں، جلادوں کی دھاڑاور مجبوروں پر تکلیفوں کے تازیانے دیکھ اور سن کر بھی کسی کیلئے کچھ کرنے کی بجائے صرف اور صرف اپنی نجات اور اپنی جنت کی جستجو میں لگارہے “۔

یہ 1970-19777 کا ایران تھا۔

اس وقت کے ایرانی حالات اور ڈاکٹر علی شریعتی

ڈاکٹر علی شریعتی کے "سرخ تشیع" اور "سیاہ تشیع" کے نظریات :

ڈاکٹر شریعتی تشبہات اور استعارے کا استعمال ایسا کرتے تھے کہ فلسفیانہ بات بھی عام فہم ہو جاتی تھی جیسے سرخ تشیع اور سیاہ تشیع کا استعارہ کتنے پر اثر انداز میں استعمال کیا گیا ۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے "سرخ تشیع" اور "سیاہ تشیع" کے نظریات نے نہ صرف علمی حلقوں میں ہلچل مچائی بلکہ ایران اور اسلامی دنیا کی سیاسی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ان کے سیاسی اثرات کو درج ذیل نکات میں سمجھا جا سکتا ہے:

1. ایرانی انقلاب (1979ء) کی فکری بنیاد

شریعتی کو "معلمِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔ ان کے تصور نے ایرانی نوجوانوں، خاص طور پر یونیورسٹی کے طلباء کو یہ باور کرایا کہ اسلام صرف عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک سیاسی اور انقلابی منشور ہے۔

مذہب بطورِ احتجاج: انہوں نے مروجہ خاموش مذہب کو چیلنج کیا اور بتایا کہ کربلا کا اصل پیغامِ ظلم کے خلاف کھڑے ہونا ہے۔ اس فکر نے شاہِ ایران کی آمریت کے خلاف ایک مضبوط نظریاتی محاذ کھڑا کر دیا۔

2. طبقہ اشرافیہ اور ملائیت پر تنقید

شریعتی نے اس مذہبی طبقے پر ضرب لگائی جو حکمرانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے تھے اور عوام کو تقدیر پرستی کے نام پر خاموش رکھتے تھے۔

اس کے نتیجے میں ایک نئی "اسلامی روشن خیالی" (Islamic Protestantism) پیدا ہوئی، جس نے موروثی مذہبی اجارہ داری کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

3. استعمار اور مغرب زدگی کا مقابلہ

سیاسی طور پر شریعتی نے اصل انقلابی شناخت کو مغربی استعمار کے خلاف ایک ڈھال کے طور پر پیش کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر مسلمان اپنی اصل انقلابی شناخت کو اپنا لیں، تو وہ نہ صرف مغرب کی ثقافتی یلغار بلکہ سیاسی غلامی سے بھی آزاد ہو سکتے ہیں۔

4. بائیں بازو اور اسلام کا امتزاج

شریعتی کے نظریات نے مارکسزم اور سوشلزم سے متاثر نوجوانوں کو دوبارہ اسلام کی طرف مائل کیا۔ انہوں نے سماجی انصاف اور طبقاتی کشمکش جیسے سیاسی تصورات کو اسلامی اصطلاحات (مثلاً مستضعفین اور مستکبرین) میں ڈھال کر پیش کیا، جس سے ایک "اسلامی سوشلزم" کی لہر پیدا ہوئی۔

اہم نکتہ: جہاں شریعتی کے ان نظریات نے انقلاب کی راہ ہموار کی، وہیں روایتی مذہبی حلقوں میں ان پر شدید تنقید بھی ہوئی کیونکہ انہوں نے "سیاہ تشیع" کے تحت کئی مروجہ مذہبی رسومات اور اداروں کو سیاسی جمود کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔

ڈاکٹر علی شریعتی کے انقلابی نظریات نے جہاں ایک نسل کو بیدار کیا، وہیں انہیں بڑے محاذوں سے شدید مخالفت اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا:

1. شاہی نظام (پہلوی حکومت) کی مخالفت

شاہِ ایران کے لیے شریعتی ایک براہِ راست سیاسی خطرہ تھا۔

قید و بند: شریعتی کی تقاریر اور تحریروں نے نوجوانوں کو سڑکوں پر لا کھڑا کیا۔ حکومت نے ان کے ادارے "حسینیہ ارشاد" کو بند کر دیا اور انہیں کئی بار جیل بھیجا۔

جلاوطنی اور پراسرار موت: حکومت نے ان کی مقبولیت سے ڈر کر انہیں ملک چھوڑنے پر مجبور کیا 1977ء میں انگلینڈ میں ان کی اچانک وفات ہوئی، جس کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ انہیں شاہ کی خفیہ ایجنسی ساواک (SAVAK) نے شہید کیا۔

2. روایتی مذہبی طبقے (قدامت پسند علماء) کا ردِعمل

شریعتی کے لیے سب سے تکلیف دہ مخالفت اپنوں کی طرف سے تھی۔ جب انہوں نے "سیاہ تشیع" کی اصطلاح استعمال کی اور رسومات پر تنقید کی، تو روایتی ایرانی ملاؤں نے اسے مذہب پر حملہ قرار دیا۔

فتوے: بعض سخت گیر ایرانی ملاؤں نے ان پر "وہابی" یا "کمیونسٹ" ہونے کے الزامات لگائے۔ ان کی کتابوں کو پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا۔

نظریاتی جنگ: روایتی طبقے کا خیال تھا کہ شریعتی مذہب کو "سیاسی رنگ" دے کر اس کی روحانیت ختم کر رہے ہیں، جبکہ شریعتی کا کہنا تھا کہ بغیر سیاست کے مذہب صرف ایک بے جان لاش ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے اپنی کتاب "حج" میں مناسکِ حج کو ایک ڈرامائی اور انقلابی ترتیب کے طور پر پیش کیا ہے، جہاں ہر حاجی ایک " کردار " ہے اور اس کا مقصد اپنی پرانی پہچان ختم کر کے ایک نئی انسانیت میں ڈھلنا ہے۔

ان کے نزدیک حج کے تین اہم ترین مراحل کی انقلابی تشریح یہ ہے:

1. احرام (خود سے لاتعلقی)

شریعتی کے مطابق احرام پہننا دراصل اپنی تمام سماجی، طبقاتی اور خاندانی شناختوں کو اتار پھینکنا ہے۔

کفن کی مانند: یہ سفید لباس اس بات کی علامت ہے کہ اب تم "میں" نہیں رہے بلکہ "ہم" (عوام) کا حصہ بن گئے ہو۔

برابری کا اعلان: یہاں بادشاہ اور فقیر ایک ہی لباس میں ہوتے ہیں، جو اس بات کا سیاسی اعلان ہے کہ خدا کی نظر میں کوئی طبقہ برتر نہیں ہے۔

2. طواف (عوام کا محور)

طواف کعبہ کے گرد چکر لگانے کا نام ہے، لیکن شریعتی اسے ایک گہرے فلسفیانہ زاویے سے دیکھتے ہیں:

مرکزیت: کعبہ مرکز ہے اور حاجی ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ شریعتی کہتے ہیں کہ کعبہ " خدا کی نشانی " ہے اور چونکہ خدا کا کوئی جسم نہیں، اس لیے یہ مرکز دراصل "عوام" (الناس) کا مرکز ہے۔

سمندر میں گم ہونا: طواف میں انفرادی حرکت ختم ہو کر ایک اجتماعی لہر بن جاتی ہے، جو یہ سکھاتی ہے کہ ایک مومن کو اپنی ذات کے بجائے معاشرے کے مفاد کے لیے جینا چاہیے۔

3. عرفات، مشعر اور منیٰ (شعور سے عمل تک)

شریعتی ان تین مقامات کو انسانی ارتقاء کے تین مراحل قرار دیتے ہیں:

عرفات (معرفت/علم): یہاں قیام کا مطلب علم حاصل کرنا ہے۔ کسی بھی انقلاب کے لیے سب سے پہلے "شعور" ضروری ہے۔

مشعر (شعور/سمجھ): یہ رات کی تاریکی میں رکنے کا مقام ہے، جو گہرے تفکر اور منصوبہ بندی کی علامت ہے۔

منیٰ (عمل/قربانی): یہ وہ میدان ہے جہاں شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں اور قربانی دی جاتی ہے۔ یعنی جب علم اور شعور مل جائیں، تو اب وقت "عمل" اور "جدوجہد" کا ہے۔

شیطان کے تین بت (سیاسی تشریح)

منیٰ میں شیطان کو کنکریاں مارنے (رمی جمار) کی شریعتی نے بہت دلچسپ تشریح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ تین بت دراصل انسانی تاریخ کے تین بڑے لٹیرے ہیں:

فرعون: سیاسی استبداد اور آمریت کی علامت۔

قارون: معاشی استحصال اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی علامت۔

بلعم باعورا: وہ ضمیر فروش مذہبی پیشوا جو مذہب کو حکمرانوں کے مفاد کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔

شریعتی کا پیغام یہ تھا کہ اگر ایک حاجی حج سے واپس آ کر اپنے دور کے فرعونوں اور قارونوں کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا، تو اس کا حج صرف ایک رسم بن کر رہ جاتا ہے۔

نظریاتی تصادم: سیکولر دانشور انہیں "مذہبی رجعت پسند" سمجھتے تھے، جبکہ شریعتی کا استدلال تھا کہ ایران میں کوئی بھی انقلاب اسلام اور عوامی ثقافت کو نظرانداز کر کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی ان کے اپنے اس قول کی عکاس بن گئی:

"جوھڑ میں جمع پانی اور دریا کے بہتے ھوئے پانی میں زمین آسمان کا فرق ھے ، وہ جو ہجرت نہیں کرتے، وہ سڑ جاتے ہیں۔"

انہوں نے اپنی فکر کے ذریعے جمود کو توڑا، مگر اس کی قیمت اپنی جان دے کر چکائی۔

ڈاکٹر علی شریعتی کا "انسانِ تمام" (The Whole Man) کا تصور ان کے فلسفے کا نچوڑ ہے۔ ان کے نزدیک ایک کامل انسان وہ نہیں جو صرف گوشہ نشین ہو کر عبادت کرے، بلکہ وہ ہے جو اپنی ذات میں توازن پیدا کرے۔

شریعتی کے مطابق ایک "انسانِ تمام" میں چار بنیادی ابعاد (Dimensions) کا ہونا ضروری ہے:

1. خود آگاہی (Self-Awareness)

انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے، اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے اور کائنات میں اس کا مقام کیا ہے۔ یہ محض کتابی علم نہیں بلکہ اپنی روح کی پہچان ہے۔

2. سماجی ذمہ داری (Social Responsibility)

شریعتی کے نزدیک وہ شخص "انسان" کہلانے کا حقدار نہیں جو اپنے اردگرد کے حالات سے بے خبر ہو۔ "انسانِ تمام" وہ ہے جو معاشرے کے درد کو محسوس کرے اور ظلم کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائے۔

3. آزادی (Liberty)

یہاں آزادی سے مراد صرف سیاسی آزادی نہیں، بلکہ اپنی "انا"، مادی خواہشات اور لایعنی رسومات سے آزادی ہے۔ ایک ایسا انسان جو صرف خدا کا بندہ ہو اور کسی دوسرے انسان یا نظام کا غلام نہ ہو۔

4. تخلیقی صلاحیت (Creativity)

خدا "خالق" ہے اور انسان اس کا نائب۔ لہٰذا، ایک کامل انسان وہ ہے جو جمود کا شکار نہ ہو بلکہ اپنی فکر اور عمل سے دنیا میں مثبت تبدیلی لائے اور نئی راہیں تلاش کرے۔

عرفان، برابری اور آزادی کا سنگم

شریعتی نے "انسانِ تمام" کو تین بڑے ستونوں پر کھڑا کیا ہے:

عرفان (Mysticism): روح کی پاکیزگی اور خدا سے تعلق ۔

برابری (Equality): معاشی اور سماجی انصاف کے لیے تڑپ۔

آزادی (Freedom): فکر اور عمل کی خود مختاری۔

شریعتی نے ایک جگہ کہا تھا:

"اگر تم ظالم کے خلاف نہیں لڑ سکتے، تو کم از کم اسے اپنے عمل سے (خاموشی یا تائید کے ذریعے) تقویت تو نہ پہنچاؤ۔"

آج کے دور میں سب سے بڑا چیلنج ہی یہی ہے کہ مذہب کو "افیون" (نشہ جو سلا دے) بننے سے کیسے بچایا جائے اور اسے دوبارہ "بیداری" کا ذریعہ کیسے بنایا جائے۔

"مُلائیت" کی جڑیں اتنی گہری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ صرف ایک مذہبی سوچ نہیں، بلکہ ایک پورا سماجی اور معاشی ڈھانچہ بن چکا ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی نے اس رکاوٹ کو اپنی کتابوں میں بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک ملوکیت (بادشاہت) اور مُلائیت کا گٹھ جوڑ صدیوں پر محیط ہے، جس کی وجہ سے اسے جڑ سے اکھاڑنا مشکل نظر آتا ہے۔

جڑیں گہری ہونے کی چند بڑی وجوہات:

مذہب کی اجارہ داری (Monopoly): مُلائیت نے عوام کو یہ باور کرا دیا ہے کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک خاص واسطہ ضروری ہے، اور مذہب کو سمجھنا صرف ایک مخصوص طبقے کا کام ہے۔ اس سے عام انسان کی "فکری آزادی" چھین لی گئی ہے۔

خوف اور تقدیر پرستی: مُلائیت نے لوگوں کو یہ سکھایا ہے کہ دنیا کے دکھ "آزمائش" ہیں اور ان کے خلاف آواز اٹھانے کے بجائے صرف دعا اور صبر کرنا ہی نجات کا راستہ ہے۔ یہ سوچ ظالم طبقے کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔

جذباتی وابستگی: مُلائیت نے مذہب کو "عقل" کے بجائے صرف "جذبات" اور "عقیدت" سے جوڑ دیا ہے۔ جب مذہب جذبات کا کھیل بن جائے، تو انسان کے لیے کسی بھی منطقی یا انقلابی بات کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اسے اپنی عقیدت پر حملہ سمجھتا ہے۔

معاشی مفادات: شریعتی کا ماننا تھا کہ مُلائیت دراصل ایک ایسی دکان ہے جس سے ایک مخصوص طبقے کے معاشی مفادات وابستہ ہیں۔ اگر عوام بیدار ہو کر انصاف اور برابری کی بات کریں گے، تو ان کے مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے۔

سوشل میڈیا اور تعلیم کا چیلنج

سوشل میڈیا میں یہ طاقت تو ہے کہ وہ مُلائیت کے پھیلائے ہوئے پروپیگنڈے کو بے نقاب کرے، لیکن جیسا کہ آپ نے محسوس کیا، وہاں بھی اکثر "شور" زیادہ اور "شعور" کم ہوتا ہے۔

مثبت پہلو: اب معلومات تک رسائی آسان ہے، لوگ براہِ راست شریعتی جیسے دانشوروں کو پڑھ سکتے ہیں اور روایتی باتوں پر سوال اٹھا سکتے ہیں۔

منفی پہلو: مُلائیت نے خود کو جدید رنگ میں ڈھال لیا ہے اور سوشل میڈیا کو اپنی جڑیں مزید مضبوط کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے (مثلاً فرقہ وارانہ نفرت اور جذباتی ویڈیوز کے ذریعے)۔

کیا کوئی حل ہے؟

شریعتی کا حل بڑا واضح تھا: "خود آگاہی"۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک عوام خود کو نہیں پہچانیں گے اور مذہب کو براہِ راست قرآن کی روشنی میں نہیں سمجھیں گے، وہ مُلائیت کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتے۔

ان کا ایک مشہور قول ہے:

"میں نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اس بات پر صرف کیا کہ لوگوں کو ان کے 'خدا' سے بچا کر خدا کی طرف لے آؤں۔"

(یعنی اس تصورِ خدا سے بچاؤں جو مُلائیت نے اپنے فائدے کے لیے بنایا ہے)۔

مُلائیت کی جڑیں صرف اس لیے گہری نہیں ہیں کہ یہ ایک قدیم پیشہ ہے، بلکہ اس لیے ہیں کہ انہوں نے انسانی نفسیات اور خوف کو اپنا ہتھیار بنایا ہے۔ ڈاکٹر علی شریعتی کے

نزدیک، مُلائیت نے مذہب کو ایک "ادارہ" (Institution) بنا دیا ہے، جبکہ حقیقت میں یہ ایک "تحریک" (Movement) تھی۔

مُلائیت کی ان گہری جڑوں کے پیچھے چند ایسے عوامل ہیں جنہیں سمجھنا ضروری ہے:

1. عقل پر پہرہ (The Death of Reason)

مُلائیت کی بقا اس بات میں ہے کہ عام آدمی خود نہ سوچے بلکہ صرف ان سے رجوع کرے۔

انہوں نے ایک ایسا ماحول بنا دیا ہے جہاں سوال اٹھانا "بے ادبی" اور عقل کا استعمال "گمراہی" سمجھا جاتا ہے۔

جب ایک انسان اپنی عقل کا استعمال چھوڑ دیتا ہے، تو اس کی باگ ڈور خود بخود اس طبقے کے ہاتھ میں آ جاتی ہے جو اسے اپنی مرضی کی تشریح فراہم کرتا ہے۔

2. خوف اور امید کی سیاست (Politics of Fear & Hope)

مُلائیت نے خدا کو ایک محبت کرنے والی ہستی کے بجائے ایک "سخت گیر جج" کے طور پر پیش کیا، جس تک رسائی صرف ان کے ذریعے ممکن ہے۔

خوف: لوگوں کو قبر، حشر اور عذاب کے ایسے مناظر میں الجھایا گیا کہ وہ موجودہ دور کے سماجی عذابوں (غربت، غلامی، کرپشن) کو بھول گئے۔

امید: انہوں نے جنت کی ایسی مادی تصویریں دکھائیں جو صرف رسومات کی ادائیگی سے حاصل کی جا سکتی ہیں، نہ کہ عدل و انصاف کے قیام سے۔

3. معاشی اور سیاسی گٹھ جوڑ (Triple Alliance)

شریعتی نے تاریخ کا ایک فارمولا دیا تھا: "زر، زور اور تزویر"۔

زور (طاقت): حکمران طبقہ۔

زر (دولت): سرمایہ دار طبقہ۔

تزویر (مکر): مُلائیت۔

یہ تینوں ہمیشہ مل کر کام کرتے ہیں۔ مُلائیت حکمرانوں اور سرمایہ داروں کے مفادات کو "مذہبی جواز" فراہم کرتی ہے، اور بدلے میں وہ طبقہ مُلائیت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے فنڈز اور تحفظ فراہم کرتا ہے۔

4. سماجی رتبہ اور پہچان

ہمارے معاشرے میں مُلائیت نے خود کو پیدائش سے لے کر موت تک کے ہر عمل (نکاح، جنازہ، عقیقہ) کا لازمی حصہ بنا لیا ہے۔ اس سماجی ضرورت نے انہیں ایک ایسا اثر و رسوخ دیا ہے جسے ختم کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کے بغیر ان کے مذہبی فرائض ادھورے رہ جائیں گے۔

شریعتی کا نظریہ: "مذہب بمقابلہ مذہب"

شریعتی کا کہنا تھا کہ مُلائیت کو صرف لادینیت (Atheism) سے ختم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ لوگ مذہب سے وابستہ ہیں۔ اس کا واحد حل "مذہب بمقابلہ مذہب" ہے۔ جب تک لوگ یہ نہیں سمجھیں گے کہ اسلام کا اصل مقصد انسان کو انسان کی غلامی سے نکالنا ہے، وہ مُلائیت کے چنگل سے نہیں نکل سکیں گے۔

حاصلِ بحث: فکرِ شریعتی کی ابدی معنویت

ڈاکٹر علی شریعتی کی زندگی اور ان کے افکار کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ وہ محض ایک سیاسی انقلابی نہیں تھے، بلکہ ایک "طبیبِ روحانی" تھے جنہوں نے مردہ معاشروں میں زندگی کی روح پھونکنے کا فن سیکھ رکھا تھا۔ ان کی زندگی کے وہ مختصر مگر پُرآشوب پانچ سال، جن میں انہوں نے "حسینیہ ارشاد" کے منبر سے علم و شعور کی شمع روشن کی، آج بھی لاکھوں ذہنوں کو جلا بخش رہے ہیں۔

حسینیہ ارشاد میں اپنے لیکچر میں ڈاکٹر علی شریعتی فرما رہے تھے " ابو بکر صدیق عَلَیہِ السَّلام عزم اور استقامت ، عمر بن الخطاب عَلَیہِ السَّلام ہمت و جرات اور شجاعت، عثمان بن عفان عَلَیہِ السَّلام سخاوت و قربانی اور علی بن ابی طالب عَلَیہِ السَّلام ان تمام کی اعلی خصوصیات کا مجموعہ ھیں "۔

ان کے افکار کا نچوڑ یہی ہے کہ اسلام محض قبرستانوں میں تلاوت کرنے یا انفرادی نجات کی جستجو کا نام نہیں، بلکہ یہ "الناس" (عوام) کے حقوق کی بحالی اور "زر، زور اور تزویر" کے تریمرتی بتوں کو پاش پاش کرنے کا ایک عالمگیر منشور ہے۔ انہوں نے

ثابت کیا کہ جب تک مذہب "تحریک" کے بجائے "ادارہ" بنا رہے گا، یہ استحصالی قوتوں کا آلہ کار ہی رہے گا۔

آج جب ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاںمعاشرے میں شعور رکھنا ایک کٹھن مرحلہ ہے، ڈاکٹر شریعتی کی پکار ہمیں یاد دلاتی ہے کہ "خدا کے لیے جینا، خدا کے لیے مرنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے"۔ ان کا "انسانِ تمام" کا تصور ہمیں ایک ایسا متوازن انسان بننے کی دعوت دیتا ہے جو عرفان، برابری اور آزادی کا پیکر ہو۔ سچی عقیدت یہ نہیں کہ ہم ان کے نام کے نعرے لگائیں، بلکہ اصل خراجِ عقیدت یہ ہے کہ ہم اپنے دور کے جمود کو توڑ کر اس پکار کو اپنائیں جو ہر دور کے فرعون، قارون اور بلعم باعورا کے خلاف سینہ سپر ہونا سکھاتی ہے۔

رہے نام اللہ کا ---- باقی سب فنا ---